ISSN(**Print**): 2709-9636 | ISSN(**Online**): 2709-9644
Volume 2, Issue IV, (October to Decmber2021)

ماخذ تحقیقی مجلہ

ڈاکٹر نسرین امین
اسسٹنٹ پروفیسر (ای لرننگ فیکلٹی) سرحد یونیورسٹی پشاور
ڈاکٹر سبحان اللہ
صدر شعبہ اردو گورنمنٹ ڈگری کالج لاہور (صوابی)
ڈاکٹر ناہید اختر
سوات

ممتاز مفتی کی "ہند یاترا" میں یادوں کا کارواں

Dr Nasreen Amin
Assistant Professor (E-Learning Faculty) Sarhad University, Peshawar.
Dr.Subhan Ullah
Head of Urdu Deptt; Govt Degree College Lahor(Swabi).
Dr.Naheed Akhtar
Swat.

Caravan of memories in Mumtaz Mufti's "Hind Yatra"

Travelogue is the genre of literature Which is emerging in an advanced form. As techniques are being experimented with in other genres of Urdu literature- One of these techniques is the flashback technique. In which the author relies on his memories. This technique has also been adopted in Urdu travelogue. Mumtaz Mufti's travelogue "Hindyatra" is also written under the flashback technique. We see that Mumtaz Mufti with the help of memories of the past in his travelogue, narrates the long history of the rise and fall of the Muslims of the subcontinent.

Keywords: *Flesh back technique, Hindyatra, A lot of memories, Homeopathy, Delhi, Darbar, Fiker Taunsvi.*

ممتاز مفتی نثری ادب کا ایک جانا پہچانا نام ہے۔ ان کا فنی سفر اردو ادب کی کئی اصناف میں پھیلا ہوا ہے۔ جن میں انہوں نے موضوعاتی اور فنی تجربے کرتے ہوئے اپنے لئے نئی راہیں نکالی ہیں۔ ان اصناف میں سے ایک

صنف سفر نامہ نگاری کی صنف بھی ہے جس میں ممتاز مفتی نے اپنے فنی جوہر دکھانے کی بہترین کوشش کی ہے۔ اردو ادب میں یوسف حلیم خان کمبل پوش کی سفر نامہ نگاری سے آغاز پانے والی اس صنف نے دنیائے ادب میں نئی نئی تکنیک روشناس کروائی ہیں۔ یعنی سفر نامہ کی صنف نے عہد قدیم کی نسبت ترقی یافتہ صورت اختیار کر لی ہے اور اردو ادب کی دوسری اصناف کی طرح اس میں بھی تکنیک کے جدید تجربات کئے جا رہے ہیں۔ جن میں سے ایک تکنیک پرانی یادوں کے سہارے حال کا سفر جاری رکھنا ہے۔ اس تکنیک کو "فلش بیک تکنیک" کہتے ہیں۔ فلش بیک تکنیک کے ذریعے مصنف کے ماضی کے تجربات و مشاہدات کو ایک نئی زندگی ملتی ہے اور وہ اس کی مدد سے اپنی تحریر میں خوبی اور گنج معنی آباد کرتا ہے۔

ممتاز مفتی نے اپنے سفر نامے "ہندیاترا" میں ماضی کے تجربات و مشاہدات کو محدود عرصے کے اس سفر میں نئی زندگی کا رنگ دے کر برصغیر کے مسلمانوں کے عروج و زوال کی ایک طویل تاریخ کو فلش بیک کے آئینے میں دکھایا ہے۔

رشید احمد "ہندیاترا" کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "یہ دراصل دوہرے سفر کی کہانی ہے۔ ایک سفر تو خارج میں اسلام آباد سے دہلی تک کا ہے اور دوسرا سفر یادوں کے حوالے سے تقریباً ایک ہزار سال کے عرصہ پر پھیلا ہوا ہے۔ مفتی نے کمال فنی مہارت سے ان دونوں سفروں کو یوں یکجا کیا ہے کہ یہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ کہاں سے یادوں کا سفر شروع ہوتا ہے اور کہاں سے خارجی سفر، دونوں ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو گئے ہیں کہ فنی طور پر ایک ایسی اکائی وجود میں آئی ہے کہ اسے حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔" (۱)

ممتاز مفتی نے اپنے دوست اشفاق حسین کے ساتھ ۱۹۸۲ء میں حضرت امیر خسروؒ کے عرس میں شرکت کے لئے بھارت کا سفر کیا تھا۔ ممتاز مفتی نے اس سفر کی روداد ۱۹۸۷ء میں "ہندیاترا" کے عنوان سے تحریر کی ہے۔ اس سفر نامے کے بارے میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں کہ:

> "کہیں کہیں اس میں سفر نامے کی جھلک نظر آئے گی، کہیں رپورتاژی تاثر پیدا ہو گا۔ کہیں کہیں ایسا لگے گا جیسے انشائیہ ہو اور کئی ایک جگہوں پر یادوں کی برات کا رنگ جھلکے گا۔" (۲)

ممتاز مفتی نے اپنے اس سفر نامے کا آغاز ماضی کی یادوں ہی سے کیا ہے، ان کے دل میں ہندوستان جانے کی خواہش جنم لیتی تھی۔ اس بارے میں لکھتے ہیں۔

"گزشتہ چونتیس سال میں کئی مرتبہ میرا جی چاہا کہ ہندوستان جاؤں۔ ایک بار اپنے گاؤں بٹالے کو دیکھوں جہاں میں پیدا ہوا تھا مفتیاں محلے کو دیکھوں جس کے چوگان میں کھیل کھیل کر میں بڑا ہوا تھا۔" (۳)

اپنی اس خواہش کے اظہار کے لیے ممتاز مفتی فلش بیک تکنیک کا استعمال کرتے ہوئے مفتیاں محلے اور اس کی گلیوں کا نقشہ اپنے قارائین کے سامنے کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ لیکن پھر تیس ستمبر ۱۹۴۷ء کا وہ دن جب وہ بٹالے سے اپنے خاندان کو لاہور لاتے ہوئے امرتسر کی سڑکوں کو لاشوں سے بھرا ہوا دیکھتے ہیں، کو یاد کر کے ہندوستان جانے کا ارادہ بدل لیتے ہیں۔

"ہاں ہندوستان جانے کی آرزو کئی بار میرے دل میں ابھرتی لیکن---ساتھ ہی ۳۰ ستمبر کا وہ سفر یاد آجاتا جب ہم ہمیشہ کے لئے بٹالہ چھوڑ کر لاہور آرہے تھے۔"(۴)

۱۹۸۱ء میں پاکستان ہجرت کے چونتیس سال بعد ممتاز مفتی ہندوستان جانے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس کے پس پشت ہومیو پیتھی کی کتب کا حصول ہوتا ہے۔ ہندوستان ہومیو پیتھی کا گھر ہے مگر وہاں سے کتابیں منگوائی نہیں جاسکتی۔ ممتاز مفتی نے اس سفر نامے میں اپنی یادوں کا پٹارا کھول کر یہ تفصیل بھی بیان کر دی ہے کہ ہومیو پیتھی سے ان کا تعلق کیسے پیدا ہوا۔ سب سے پہلے ۱۹۴۰ء کا واقعہ بیان کرتے ہیں جب ان کی محبوبہ بیوی (انور سلطان) بیمار پڑ جاتی ہے اور ڈاکٹروں کی طرف سے جواب ملنے پر اُسے لُدھیانے کے ڈاکٹر محمود کے پاس لے جایا جاتا ہے جس کے علاج سے وہ صحت یاب ہو جاتی ہے۔

اس بارے میں ممتاز مفتی لکھتے ہیں:

"ہومیو پیتھی کے اس معجزے پر میں حیران تو ہوا لیکن مجھے یہ شعور نہ تھا کہ یہ معجزہ ہومیو پیتھی کا ہے۔ میں اسے معالج کا معجزہ ہی سمجھتا رہا۔ مجھے علم نہ تھا کہ محمود ایک ہومیو پیتھ ہے۔"(۵)

دوسرا واقعہ ۱۹۵۴ء کا بیان کرتے ہیں جس میں ان کی روالپنڈی کے ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر کے ساتھ شرط لگتی ہے اور وہ ہومیوپیتھ ڈاکٹر اپنی ہومیوپیتھی کی وجہ سے شرط جیت جاتا ہے لیکن مفتی صاحب پھر بھی ہومیوپیتھی کے اعجاز کو تسلیم نہیں کرتے ۔ تیسرا واقعہ ۱۹۷۵ء کا بیان کرتے ہیں۔ جب انہیں ہر آٹھ دس دن بعد دورے پڑتے اور انہیں اٹھا کر ہسپتال لایا جاتا، ہسپتال میں ان کو طبی امداد دے کے رخصت کر دیا جاتا کہ یہ ایک خوفناک قسم کی الرجی ہے اور اس کا علاج ممکن نہیں۔ ایسے میں ممتاز مفتی مدد کے لیے اشفاق احمد کے پاس جاتے ہیں، اشفاق احمد ان کا علاج ایک ہومیوپیتھ ڈاکٹر سے کراتے ہیں ۔ جس کے بعد ممتاز مفتی ہومیوپیتھی کے قائل ہو جاتے ہیں اور باقاعدہ ہومیوپیتھی کی کتب کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔

> "احمد خان کی دوا نے میرے دورے ختم کر دیئے ۔اس بات پر میں اتنا خیران ہوا کہ ہومیوپیتھی کو جانے کے لئے بے تاب ہو گیا۔"(۶)

اسی مطالعے کے دوران ایک روزان کے دوست اشفاق حسین کی بیماری سے متعلق ایک نسخہ سامنے آتا ہے۔ اشفاق حسین موقع پر موجود ہوتے ہیں چنانچہ ان پر یہ نسخہ آزمایا جاتا ہے جس سے ان کی تکلیف دور ہو جاتی ہے ۔ تجربے کی کامیابی پر وہ ہومیوپیتھی کا پروانہ بن گئے۔

> "یوں ہند جانے کا منصوبہ آپ ہی آپ بن گیا اور میں بھول گیا کہ سرحد کی سرزمین مسلمانوں کے خون سے ابھی تک رنگین ہے اور مشرقی پنجاب کے لاکھوں شہید حیرت سے میری طرف دیکھ کر پوچھ رہے ہیں کہ کہاں جا رہے ہو، یہ تم کیا کر رہے ہو۔(۷)

اپنے اس شوق کی تکمیل کے لئے ممتاز مفتی زائر کا روپ دھار کر، ہومیوپیتھی کا طالبعلم بن کر ہند کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ یہ سب کرنے کے لیے انہیں کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سب کو لفظ بہ لفظ بیان کیا گیا ہے۔ ان کے سفر کا آغاز لاہور میں داتا دربار سے ہوتا ہے اور یہی اس سفر نامے کا آغاز ہے۔ ممتاز مفتی داتا دربار کا احوال بیان کرنے کے ساتھ قارئین کو داتا کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہیں اور کچھ اپنی پُرانی یادیں تازہ کر لیتے ہیں۔ دونوں طرف کے کسٹم ہاوس سے فارغ ہونے کے بعد انہیں بسوں میں بٹھا دیا جاتا ہے اور بسیں روانہ ہو جاتی ہیں۔ سفر میں سب سے پہلے اٹاری کا علاقہ آتا ہے۔ ممتاز مفتی اٹاری کا نام سنتے ہی پھر سے پُرانی یادوں میں گم ہو جاتے

ہیں اور جب ان کی بس امر تسر کے مضافات میں داخل ہوتی ہے تو بھی ماضی کا ایک ایک منظر ان کی نظروں کے سامنے گھوم جاتا ہے۔

"امر تسر میرے لئے ایک متبرک شہر تھا چونکہ وہاں میری اولین محبوبہ رہتی تھی۔ ٹین ایج کی محبوبہ ایک ہیولہ ہوتی ہے۔ ایک دھندلی تصویر۔ وہ جسم نہیں ہوتی۔ ان دنوں میں اس شوخ اور رنگین تصویر کو سینے سے لگائے سارے امر تسر میں بادیہ پیمائی کرتا پھرتا تھا۔"(۸)

امر تسر سے آگئے کا سفر ٹرین سے کرنا تھا۔ ممتاز مفتی کو جب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں سے جانے میں ابھی بہت وقت ہے تو ان کے دل میں امر تسر کی سیر کی خواہش پیدا ہوتی ہے، وہ ایک تانگہ لے کر امر تسر گھومنے نکل جاتے ہیں اور اپنی پُرانی یادیں تازہ کرتے ہیں۔ بہت کچھ بدل چکا تھا لیکن بہت کچھ اب بھی اپنی پُرانی طرز پر موجود تھا۔ واپس اسٹیشن آنے پر انہیں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے دلّی فرنٹیر میل سے جانا ہے تو ممتاز مفتی کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔

"ارے ہم تو فرنٹیر میل سے سفر کر رہے ہیں۔ میری زندگی میں فرنٹیر میل کی حیثیت ہمیشہ ایسے رہی جیسے دیہاتی کے لئے میلہ ہو۔---وہ مدرسہ جہاں میں پڑھا تھا۔ ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب تھا، ریلوے ٹائم ٹیبل بنانے والوں نے ہم پر یہ احسان کر رکھا تھا کہ فرنٹیر میل کی آمد کا وقت تفریح میں پڑتا تھا۔ جونہی ریس کی گھنٹی بجتی---سٹیشن پر پہنچ کر ہم سانس لیتے کہ ابھی فرنٹیر میل نہیں آئی ساتھ ہی فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کہیں زیادہ لیٹ نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تفریح، تفریح کے بغیر گزر جائے۔----خانیوال میں ہمارے دو ہی مشاغل تھے۔ فرنٹیر میل کی پھل پتیاں پھر جگالی ہی جگالی۔"(۹)

لیکن جب ٹرین پلیٹ فارم پر آئی اور ممتاز مفتی نے دیکھا۔

"میں رک گیا اور بوگی کو دیکھنے لگا۔ بوگی کا رنگ نہ کریم تھا نہ براؤن۔ پتہ نہیں کیا رنگ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پینٹ کی جگہ زنگار لگایا ہوا ہو۔ یہ بوگی فرنٹیر میل کو لگا رہے ہیں کیا۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ اس میں فرنٹیر میل کا اپمان ہے۔ فرنٹیر میل تو رنگ وروپ کی گاڑی ہے۔ اس میں زنگار کیسے لگ سکتا ہے۔"(۱۰)

ممتاز مفتی نے بوگی میں بیٹھنے کے بعد اس کا جائزہ لیا اور اسے جیل گاڑی سے تشبیہ دی، زائرین کی گنتی ہوئی اور گاڑی منزل مقصود کی طرف چل پڑی۔ گاڑی کے چلنے کے ساتھ ہی ان کی یادوں کی برات پھر چل پڑی ۔بٹالا، موگا، امر تسر، دوآبہ، پھلور، جالندھر، لودھیانے، انبالہ کو یاد کیا ان سے تعلق رکھنے والے واقعات دہرائے۔

"میرے روبرو بٹالے کا مفتیاں محلّہ از سرے نو آ کھڑا ہوا۔---مجھے موگا کا ہسپتال یاد آ گیا ۔لاٹاں یاد آ گئی۔---اب ہم دو آبے کے علاقے سے گزر رہے تھے۔ مجھے دو آبے سے بڑا لگاؤ تھا۔---پھر پھلور تھا۔ پھلور کے سٹیشن کو میں بڑے اہتمام سے دیکھا کرتا تھا---- میرا جی چاہتا تھا میں جالندھر دیکھوں۔ وہاں کا گڑ کھاؤں۔ وہاں کی شدھ بولی سنوں۔ جالندھریوں سے بات کروں۔ ان کے پاس بیٹھوں۔---لودھیانے اور انبالے میں میں نے زندگی کے کئی سال گزارے تھے۔ انبالے میں میں جوانی کی اوّلین بیداری سے شناسا ہوا تھا۔---گاڑی فراٹے بھرتی جا رہی تھی۔ باہر نہ جالندھر تھا نہ پھلور تھا نہ انبالہ تھا۔ صرف گھپ اندھیرا، گاڑھا اندھیرا۔"(۱۱)

ممتاز مفتی کھڑکی سے باہر دیکھنے کے لئے بے چین تھے لیکن ایک تو رات کا گھپ اندھیرا، دوسرا کھڑکی میں لگی ہوئی لوہے کی سلاخیں رکاوٹ بنی ہوئی تھیں۔ ممتاز مفی اپنی بے چینی کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"ظالمو! یہ کیا کیا کہ مجھے رات کی گاڑی میں سوار کر دیا۔ اگر بتیس سال بعد میں انجانے پہچانے علاقوں کو ایک نظر دیکھ لیتا تو تمہارا کیا بگڑ جاتا۔"(۱۲)

انہی خیالات میں گم نا جانے کس وقت ممتاز مفتی نیند کی وادی میں اتر جاتے ہیں اور جب بیدار ہوتے ہیں تو زائرین اپنے بستر سمیٹ رہے ہوتے ہیں کیونکہ ان کی منزل قریب تھی۔ جب زائرین دلّی کے پلیٹ فارم پر اترے تو وہاں سے انہیں سیکیورٹی کے ساتھ بسوں میں بٹھا کر لے جایا گیا۔ زائرین کی بسیں چلیں تو ممتاز مفتی ایک مرتبہ پھر سے یادوں کی دنیا میں غوطہ زن ہو گئے۔

"ہاں تو یہ وہ دلّی ہے۔ میں نے سوچا وہ دلّی۔ مجھے بیتے ہوئے دن یاد آ گئے۔ پہلی مرتبہ جب ہم دلّی گئے تھے تو میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا۔ ان دنوں میرے والد روہتک میں متعین

تھے۔ دلّی میں ماموں رہتے تھے۔ ماموں نے بلایا تھا۔اتنا بڑا شہر دیکھ کر میں گھبرا گیا تھا ۔چوڑی چوڑی سڑکیں۔بڑی بڑی عمارتیں۔کھچا کھچ بھرے بازار۔"(۱۳)

"پھر مجھے وہ دن یاد آگیا جب میں آخری مرتبہ دلّی گیا تھا۔---وہاں مجھے ایک انوکھے موضوع پر ٹاک دینے کے لئے بلایا گیا تھا۔عنوان تھا ٹھمریوں میں شاعری۔"(۱۴)

"مجھے وہ دن یاد ہے جب میں پہلی مرتبہ دلّی کی جامع مسجد میں داخل ہوا تھا۔میں نے تالاب کے کنارے بیٹھ کر وضو کیا تھا اور پھر حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک برآمدے تک پہنچا تھا۔حاجی صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا میں ان کے روبرو بیٹھ گیا تھا۔پھر انہوں نے میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیے تھے۔"(۱۵)

انہی یادوں کے سفر کے ساتھ ممتاز مفتی کا قافلہ ہمایوں کے مقبرے پر جاکر رک جاتا ہے یہاں سکاؤٹ کیمپ ہال میں انہیں ٹھہرایا جاتا ہے۔ممتاز مفتی اپنی عادت کے مطابق ہال کا باریک بینی سے جائزہ لینے کے بعد قارئین کے سامنے اس کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ممتاز مفتی اور اشفاق حسین ناشتے کے لئے بازار جاتے ہیں۔ممتاز مفتی اس راستے، دکانوں اور لوگوں کا بھی نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔پھر جس دن زائرین مزار پر حاضری دینے جاتے ہیں تو ممتاز مفتی جانے میں شرمندگی محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ تو ہندوستان ہومیوپیتھی کی کتابیں لینے آئے تھے ان کا مقصد ہومیوپیتھی کی کتب تھا۔حضرت امیر خسرو کا عُرس دلّی جانے کا ایک بہانہ تھا۔اب کس منہ سے سلام عرض کرتے۔ ممتاز مفتی امیر خسرو اور حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار میں حاضری کے لیے حاضر ہوئے لیکن خود پر ان کی عقیدت کی کیفیت طاری کرنے میں ناکام رہے۔ممتاز مفتی حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر بھی حاضری دینے جاتے ہیں ۔پہلے روز مزارات پر حاضریاں دیں اور اگلے روز ہومیوپیتھی کی کتابیں خریدنے نکل گئے۔ممتاز مفتی دریاگنج کے بازار میں گھومتے پھرتے ہر چیز کا جائزہ لیتے ہیں کہ اچانک ایک پانی کی ریڑھی دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کہ اس پر پانی پینے کے لئے صرف ایک گلاس رکھا ہے۔جبکہ تقسیم سے پہلے ہندوستان بھر میں ہندو پانی اور مسلمان پانی الگ الگ رکھا جاتا، ہندو اس وقت تک پانی نہ پیتا جب تک ہندو پانی نہ ہوتا۔اسی ہندو پانی کی وجہ سے ممتاز مفتی کی ملاقات رام دین ۱۶ سے ہوئی تھی۔ممتاز مفتی نے اپنے اس واقعے کو "ہند یاترا" میں دھرم بھرشٹ ۱۷ کے عنوان سے دہرا دیا ہے۔دریاگنج کے بازار سے انھوں نے ہومیوپیتھی کی کتابیں خریدی اور سکاؤٹ کیمپ واپس آئے تو ہر کوئی انہیں دیکھ

کر حیران ہو رہا تھا کہ یہ کیا اٹھا لائے ہیں۔ ممتاز مفتی نے اپنے دلّی جانے کی اطلاع صرف فکر تونسوی کو دی تھی۔ فکر تونسوی، ممتاز مفتی کے بہت اچھے دوست تھے۔ وہ بر صغیر کے ایک بڑے شاعر، نثر نویس، طنز نگار اور کالمسٹ تھے۔ دلّی پہنچنے پر ممتاز مفتی کو امید تھی کہ فکر تونسوی ان سے ملنے آئے گا۔ لیکن انھیں ممتاز مفتی کا خط دلی پہنچنے کے کئی دن بعد ملتا ہے اور وہ خط ملتے ہیں ان سے ملنے آتے ہیں۔

> "جب ایک زائر نے مجھے اطلاع دی کہ مجھ سے کوئی ملنے آیا ہے تو میں حیران ہوا۔ مجھ سے بھلا کون ملنے آئے گا۔ فکر کو تو میں اپنے ذہن سے خارج کر چکا تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ فکر تونسوی میرے روبرو آ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر وہی ادھوری مسکراہٹ تھی۔ "ارے---تو فکر ہے کیا۔" میں نے چلّا کر کہا۔ "نہیں میں نہیں مانتا۔ تُو تو کوئی بوڑھا کھوسٹ ہے۔ تو فکر نہیں۔ تو تو مجھ سے بھی زیادہ بوڑھا ہے۔---بڑی مشکل سے وہ بولا۔ "تیرا خط آج ہی ملا ہے۔ ابھی۔"(۱۸)

فکر تونسوی، ممتاز مفتی کی اپنے گھر میں دعوت کرتے ہیں۔ ممتاز مفتی اور اشفاق حسین ان کے گھر جاتے ہیں۔ انھوں نے چند اور مہمانوں کو بھی بلایا ہوتا ہے۔ ان کی خوب محفل جمتی ہے۔ محفل کے اختتام پر جب ممتاز مفتی ان سے جانے کی اجازت طلب کرتے ہیں تو فکر تونسوی بڑی محبت سے ان کا ہاتھ پکڑ کر ہند کا سفر نامہ لکھنے کی فرمائش کرتے ہیں۔

> "فکر نے بڑی محبّت سے میرا ہاتھ دبایا۔ بولا "کچھ لکھے گا۔"
>
> میں نے پوچھا۔ "کیا؟"
>
> "سفر نامہ" "دلّی کا۔"----
>
> فکر! میں نے کہا، بڑے بڑے لکھنے والوں نے لکھا۔ ہم تو ان کی خاکِ پا بھی نہیں ہیں۔
>
> ----"اچھا" اس نے آہ بھری۔ "تو تُو سفر نامہ نہیں لکھے گا۔"
>
> کیا پتہ لکھ دوں۔----
>
> ہمارے حق میں لکھے گا؟ اس نے پوچھا۔
>
> "تیرے؟"

"نہیں ہند کے۔"(۱۹)

ممتاز مفتی کا یہ سفر نامہ ماضی اور حال کے تجربات کے ساتھ اپنے اختتام کی طرف بڑھتا ہے اور اس کا آخری باب "آخری دن" انشائیہ انداز کے ساتھ ختم ہوتا ہے۔

"ہندیاترا" کا یہ سفر جو ممتاز مفتی نے ہومیو پیتھی کی کتب کے حصول کی خاطر اختیار کیا تھا۔ اس میں ان کی پوشیدہ محرکِ ماضی کی مانوس اور محبوب گزر گاہوں سے ایک مرتبہ ملاقات کی خواہش کا جذبہ بھی شامل تھا، لیکن اس کے لئے انھوں نے ایک عظیم بزرگ کے عرس کی تقریب کا سہارا لیا۔ یوں یہ سفر عظیم روحانی فیض سے روح کو سیر اب کرنے کا عمل بھی بن گیا۔ اس سفر میں ممتاز مفتی کے جسمانی سفر کے ساتھ ساتھ ان کی یادوں کی برات بھی شاملِ سفر رہتی ہے اور وہ ماضی میں بسنے والے شہروں اور ان شہروں میں بسنے والوں کی زندگی کی جھلکیاں دکھاتے ہوئے آگئے بڑھتے جاتے ہیں۔ ہند کے ماضی اور حال کا یہ تقابلی سلسلہ ایک باطنی رو کی طرح پورے سفر نامے میں جاری و ساری رہتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رشید احمد بشمول ہندیاترا، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۱۲

۲۔ ممتاز مفتی، ہندیاترا، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۱۱

۳۔ ایضاً، ص ۲۱

۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۔ ایضاً، ص ۲۶

۶۔ ایضاً، ص ۲۸

۷۔ ممتاز مفتی، ہندیاترا، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت جولائی ۲۰۰۸ء، ص ۲۹

۸۔ ایضاً، ص ۶۹

۹۔ ایضاً، ص۹۵

۱۰۔ ایضاً، ص۹۶

۱۱۔ ایضاً، ص۱۰۲تا۱۱۱

۱۲۔ ایضاً، ص۱۰۳

۱۳۔ ایضاً، ص۱۱۹

۱۴۔ ایضاً، ص۱۲۲

۱۵۔ ایضاً، ص۱۲۵

۱۶۔ علی پور کا ایلی از ممتاز مفتی، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت دسمبر ۲۰۱۷، ص۶۶۰

۱۷۔ ممتاز مفتی، ہندیاترا، الفیصل ناشران لاہور، سن اشاعت جولائی ۲۰۰۸ء، ص۲۰۲

۱۸۔ ایضاً، ص۲۵۲

۱۹۔ ایضاً، ص۲۶۵